چودھری محمد شفیق ایڈووکیٹ۔ ملتان

زندۂ جاوید شخصیت

ذیل کا مضمون دراصل چودھری صاحب کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۹۱ء میں شاہ جی کی یاد میں دارِ بنی ہاشم میں منعقدہ تقریب میں کی۔ بعد میں اس تقریر کو انہوں نے نظر ثانی کر کے مربوط کر دیا۔ (کفیل)

کائنات کے تخلیقی، تدریجی ارتقاء اور نشوونما کی گلکاریاں، مصور حقیقی کی تدبیر اور منشاء کے عین مطابق، کمال اہتمام انصرام کے ساتھ ہزارہا برس کی معلومہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انسان اور انسان سے وابستہ مظاہر کائنات، لحہ بہ لحہ رونما ہونے والی تبدیلیوں کی حکایت دلفروز، کمال دیانت کے ساتھ اس طور پر منتقل کرتے چلے آرہے ہیں کہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلو کے اعتبار سے انسانی صلاحیت اور استعداد کی بے شمار وسعتیں اور جہتیں آشکار ہوتی ہیں۔ چشم بصیرت تاریخ کے اوراق سے اسباق اور عبرتیں حاصل کرنے کے ساتھ اسباب و علل کے نظام سے بھی آشنا ہوتی ہے۔ تاریخی عمل افراد کے ہاتھوں ہی جاری و ساری رہتا ہے۔ کچھ افراد یا شخصیات تاریخی عمل کے منطقی نتیجہ کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان کی شخصیت کی تعمیر تاریخ کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اور کچھ شخصیات کے ہاتھوں خالق کائنات تاریخ سازی کی اہم ذمہ داریاں سرانجام دلاتے ہیں۔

نگہ کر غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ بیگانہ اپنی موج سے رہ سکتا نہیں دریا

تجلیات کا نزول بلا انقطاع، اک گونہ تواتر، تسلسل اور تناسب و توازن کے ساتھ، مقتضائے زمانہ کے مطابق ہماری آنکھوں کے سامنے وا ہوتا رہتا ہے۔ تاریخ کے دھاروں کے رخ موڑنے والے ہاتھ، شخصیات خال خال ہی پیدا ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کسی ایک نشست میں ایسی شخصیت کے تمام کمالات کا احاطہ ممکن نہیں۔ ایک فرد کا ذکر دراصل ایک دور کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی و دینی تذکرے پر محیط ہوتا ہے۔ نشستیں، تذکروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تذکرے لائبریریوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ لمحے صدیوں میں تبدیل ہوتے ہیں اور تعارف ہے کہ تکمیل ہی نہیں پاتا۔

بحر اوقیانوس کے ساحل سے بحر الکاہل کے جزائر تک تین براعظموں میں پھیلی ہوئی منفرد و یگانہ تہذیب کی علمبردار ملت غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔ مرکز ملت (خواہ نام ہی کو سہی) اور نظم ملت سامراجی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو چکا ہے۔ انحطاط تمام شعبوں میں اپنی آخری حدوں پر ہے۔ ماہرین عمرانیات کے نزدیک تہذیب موت کی دہلیز پر ہے۔ کسی لمحہ بھی وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ ملت کے جغرافیہ کا شمال مغربی کونہ، ملت کے فرزانوں سے خالی ہو چکا ہے۔ غرناطہ و الحمرا کی ثقافت دم توڑ چکی ہے۔ ملت کا مشرقی کنارا پرتگیزیوں کے تصرف میں ہے۔ شمال کی جانب زار روس کی چیرہ دستیاں تاراج میں مصروف ہیں۔ برصغیر ہند کی حالت اس صورت حال سے مختلف نہیں ہے۔ مسلمانوں کی حکومت قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ راجواڑے بھی دم توڑ رہے ہیں۔ مدافعت اور مزاحمت کے تمام سلسلے سسکیاں لے رہے ہیں۔ برطانوی سامراج کے زیر تسلط علاقوں میں سورج اپنی تمازتوں کے نصف النہار پر ہے۔ پینتیس کروڑ کی آبادی کا حکمران اس قدر مستحکم ہو چکا ہے کہ چند ہزار فرنگی نفوس امور مملکت سرانجام دینے کے لئے انتہائی کافی باور کرتا ہے۔ کارہائے مملت کے تقاضے، ہندوستان کے باسی ہی اس قدر خوبی اور وفاداری سے ادا کر رہے ہیں کہ حکومت کو افرادی

قوت کی کمی کا احساس تک ہی نہیں ہو پاتا۔ ایک سو صرف ایک سو برس کی مدت میں نیا نظام تشکیل پا چکا ہے۔ جو نہ صرف نظم مملکت کے لئے کافی اور شافی ہے بلکہ اسلامیان ہند کی بنیادی اساس پر بھی ضرب کاری لگا رہا ہے۔ اسلاف کے افکار کے ساتھ عربی، فارسی سے بھی رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ نئی زبان پروان چڑھ چکی ہے۔ علم کے سرچشموں کے راستے نظروں سے اوجھل کر دیئے گئے ہیں۔ پیمانے اور قدریں تبدیل کر دی گئی ہیں۔ علم اب صرف ذریعۂ روزگار رہ گیا ہے۔

کیا کہوں احباب کیا کارہائے نمایاں کر گئے
بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

دین ایک متحرک قوت کی بجائے رسم ہو گیا۔ اجتماعی نظام کی بجائے انفرادی عمل قرار دے دیا گیا ہے۔ دین اب مذہب کہلانے لگا ہے۔ اکابرین کی تحریری، تقریری، عملی کاوشوں اور تدابیر کے فوری نتائج سامنے نہ آنے کی بناء پر ان کا جہد، جہد کے راستوں کی ابتلاء، اذیتیں، صعوبتیں، شاہوں اور تاجوروں سے برسرپیکار ہونے کا طرز عمل غرضیکہ وہ تمام اسلوب تبلیغ و جہد جو انبیاء علیہم السلام کا طریق ہے اپنی سہل پسندی اور گریز پائی کے سبب ناقابل عمل قرار پا چکے ہیں۔ بڑی خوش الحانی اور صوتی زیر و بم کے ساتھ فرنگی توپوں میں کیڑے ڈالے جانے کی دعائیں جاری ہیں۔ دین کے داعی صرف اس پر قانع ہو چکے ہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ فکری انتشار ہے کہ الاماں! جنگ آزادی کو اغیار نے غدر قرار دیا۔ ہم نے بغاوت ہند تسلیم کیا۔

اسلامی افکار، شعار اور شخصیات کے بارے میں نقطہ نظر محض دفاعی ہی نہیں اس قدر مغلوبانہ ہوا کہ جہاد ہی موقوف کر دیا گیا۔ فلاح کے ان گنت راستے، افکار کی مختلف نوعیتیں اور مغربی تہذیبی یلغار نے سوچ کو ہی غلامانہ کر دیا ہوا ہے۔ دین پر تیقن مفقود، عمل ناپید۔

ایسے عالم میں ایک صاحب عمل شخصیت کی ضرورت، ایسا صاحب عمل جو عین الیقین کی منزل سے گزر کر تیقن کی دولت سے مالامال ہو۔ شدت وحدت کا ایسا حسین امتزاج کہ حق بات کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اپنے تمام اثاثے، تمام توانائیاں نثار کر دے۔ افراد کو جماعتی نظم میں لائے۔ قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، نگر نگر، صبح و شام اپنے کردار و گفتار سے جو اس کے بس میں ہے کر گزرے۔ ہر وہ بات، ہر وہ عمل اپنوں نے کہی ہو یا غیروں سے سرزد ہوا گر کسی طور پر اس کے دین سے متحارب یا متصادم ہو تو سینہ سپر ہو جائے۔ مصلحتیں اس کی راہ میں آڑے نہ آئیں اور ہمہ وقت لڑائی کے لئے تیار رہے۔ دین ہی اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہو

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

تاریخ میں ایسی شخصیات بھی نظر آتی ہیں جو رسمی سطح پر زیست بسر کرتی ہیں۔ امور کی انجام دہی بھی رسمی طور پر ہوتی رہتی ہے۔ خوبیاں اور خامیاں رسمی سطح پر ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں۔ نماز بھی ادا ہو رہی ہے اور سودی کاروبار بھی جاری ہے۔ ترک و اختیار کا عمل شعوری کار فرمائی کے بغیر وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کا دیا ہوا طرز عمل، ابتداء میں شعوری سطح پر قائم رہتا ہے۔ پھر تقلید کے دور میں داخل ہوتا ہے۔ کہ عمل کی علت، غرض و غایت اور مقاصد ہی مر جاتے ہیں۔ معاشرے حیوانی سطح پر اتر آتے ہیں یہی وہ مرحلہ ہے جہاں شخصیت اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ سیاسی، سماجی، عصری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے امراض کی نشاندہی اور ان کے لئے زندگی بخشنے والا علاج تجویز کرتے ہیں۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر جنم لینے والے افراد واقعی معاشروں کو زندگی دے جاتے ہیں؟ ایک سوال ہے جس کا جواب تاریخی تجزیہ میں پوشیدہ ہے۔ تجزیے پچاس برس میں مکمل نہیں ہوتے۔ اور برصغیر کے تاریخی مدارج کا تجزیہ مکتب اور یونیورسٹی کی مغائرت کے پس منظر میں اور بھی زیادہ مدت کا متقاضی ہے۔ جب تجزیے کھل کر سامنے آئیں گے اور معاشرہ کو زندگی بخشنے والی شخصیات نکھر آئیں گی۔

ذرا چشم تصور وا کیجئے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر کچھ لوگوں کے نزدیک زندگی مغربی فکر کو اپنانے میں پوشیدہ تھی اور کچھ لوگوں کے نزدیک مغربی طرز زیست سے پرہیز میں زندگی مضمر تھی۔ خواہ رسمی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس پہ طرفہ تماشا جاگیرداری و سرمایہ داری کا تحفظ بھی مطلوب و مقصود تھا۔ شمال و مغرب کے دونوں طرز زیست کرۂ ارض پر کار فرما تھے۔ مغرب سے گریز شمال کی ترغیب کا باعث تھا اور شمال سے دوری مغرب کی قربت کا قرینہ رکھتی تھی۔ علی گڑھ، دیوبند، جامعہ ملیہ دہلی، مسلم لیگ، جمیعت العلماء ہند، مجلس احرار، خاکسار، رجعت پسند، ترقی پسند، قوم پرست افکار، دبستان، جماعتیں، تحریکیں اسی فکری انتشار کی آئینہ دار ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ قدم قدم پر سازشیں اور ریشہ دوانیاں، غداروں کے

جلو میں کار فرما نظر آتی ہیں۔

اس پس منظر میں ملت اسلامیہ کی مسیحائی کا بیڑا اٹھانے کے لئے فکر و عمل کے ہر موڑ پر کسی اور رعایت کو خاطر میں لائے بغیر رہبری کی ذمہ داریاں صرف اس شخص کے سپرد کی جاسکتی ہیں جو دینی فکر میں پیدا ہونے والی یا لے جانے والی ہر کجی کی نشاندہی کر سکے اور اسلاف کی اس عظیم میراث کو بہا لے جانے والے سیلاب کو دریا کی حدود میں مقید کر سکے۔

مدرسہ قاسم العلوم کی مشرقی دیوار سے ملحقہ گلی، کچہری روڈ اور محلہ ٹبی شیر خاں کو براستہ پرانا برف خانہ سے ملاتی ہے۔ محلہ ٹبی شیر خان اور کوٹلہ تولے خان کے سنگم پر واقع ایک کچا مکان جہاں دیدہ و جہاں گزیدہ بوریا نشین کا مسکن ہے۔ کچہری روڈ پر حکیم محمد اجمل خان رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتگان حکیم عطاء اللہ مرحوم اور ان کے خلف الرشید حکیم محمد حنیف اللہ صاحبان کا دوا خانہ ہے۔ کم از کم دن میں ایک بار یہ گلی، متین، وجیہہ اور پروقار شخصیت کے قدموں سے ہر روز برسوں تک لپٹتی رہی۔ کم سن آنکھیں، مرتبہ اور مقام شخصیت سے نا آشنا ہونے کے باوجود اس راستے پر مرکوز ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔ آداب بجا لائے جاتے ہیں۔ دست شفقت سائبان بنتا ہے۔ تمازت لمس کے ساتھ ہی شفقتوں کے دھارے بہہ نکلتے ہیں۔ دعائیں پل بھر میں قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہیں۔ کم سن خود کو بالغ نظر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنا قد بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حریص شفقت اگلے روز کے انتظار میں چلا جاتا ہے۔ شخصیت بزرگوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بزرگوں کو اٹھنے سے روک دیا جاتا ہے۔ لمحہ پہلے دعائیں دینے والی شخصیت دعاؤں کی طلبگار بن جاتی ہے۔ گفتگو کا یارا نہیں۔ قلب و نظر مسحور ہو چکے ہیں۔ یہ سحر آج بھی اس گلی میں طاری ہے اور کیوں نہ ہو یہ معمول بھی تو کم و بیش ایک دہائی پر محیط ہے۔ سفید ریش، پر نور چہرہ، سرخی مائل رنگت، دل موہ لینی والی آنکھیں، مضبوط و کشادہ سینہ، میانہ قد، عصا بدست سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی گزر گاہ ہے۔

ہم قریہ قریہ ڈھونڈ چکے کہیں اس کی مثال نہیں ملتی
نہ پیکر اس کے پیکر سا نہ لعبہ اس کے لعبہ سا

اپنی تمام تر صلاحیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ برصغیر ہند میں تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر مردانہ وار جولا نگاہ میں اترتے ہیں۔ خیبر سے لے کر راس کماری تک، کون سا شہر، قصبہ، گاؤں، نگر اور قریہ ایسا ہے جہاں انہوں نے قدم رنجہ نہیں فرمایا۔ فرد کو مجلس احرار میں تبدیل کر دیا۔ دین کے حوالے سے ہر کجی کو سیدھا کیا۔ ہر محاذ پر مردانہ وار اترے اور کامران ہوئے۔ مغربی افکار ہوں کہ مشرقی، دین پر یورش شمال سے ہو یا جنوب سے ابھرے۔ ارتکاز دولت کی تمام شکلیں، جو کسی طور بھی مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کسی فرد سے وابستہ ہوں یا اشتمالیت و اشتراکیت کے زیر اثر کسی جماعت کے ہاتھوں منظم ہوں ملت اسلامیہ کے لئے مضر ہیں۔ سرمایہ پرست کبھی بھی معاشروں کی زندگی نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہر حکومت وقت کی تائید ہی کر سکتے ہیں۔ فرنگی سامراج کے ساتھ ساتھ ارتکاز دولت کے خواہش مندوں اور ہمنواؤں اور ان کی سرپرست پاپائیت

ان کی ضرب کا شکار ہوئی۔ اور یہ اسی ضرب کاری کا نتیجہ ہے کہ ہم شعوری طور پر محسوس کرتے ہیں اور جان چکے ہیں کہ دشمنان دین نے کہاں کہاں سرنگ لگائی ہے۔ وہ کون کون سے شعبے ہیں جو ہماری دینی فکر کو پامال کرتے رہے ہیں اور کرنے کے در پے ہیں۔ رافضیت نے ہمیں کہاں کہاں زک پہنچائی۔ مرزائیت نے کیوں کر نقصان پہنچایا۔ یہودیت نے کہاں آگ لگائی۔ نصرانیت کی سازشوں کا کیونکر شکار ہوئے۔ ہماری تہذیب کیسے ہندوائی گئی۔ رہبانیت کیسے در آئی۔ خوبصورت خانقاہی نظام کیونکر گھنا گیا۔ فکر جامد کیوں ہو گئی۔ اور یہی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کا وہ گرانقدر عطیہ ہوتا ہے جو معاشروں کو زیست کرنے کا ہنر دے جاتا ہے۔

محبت اور نفرت کی بنیادیں محض جذباتی نہ تھیں بلکہ شعوری طور پر تھیں۔ انسانوں سے محبت وہ ہمیشہ بلا امتیاز رنگ و نسل و عقیدہ کرتے رہے۔ لیکن انسانوں میں ہی موجود ہر برائی سے انہوں نے نفرت کی۔ یہ امتیاز، یہ شعور شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں کوئی نیا نہ تھا۔ موصوف اس فکر کے خود خالق نہ تھے۔ بلاشبہ یہ فکر، یہ نظریہ، یہ سوچ، چودہ سو برس قبل ہادی کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مرحمت کی تھی۔ کہ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے الٰہی کی جستجو میں محدود کر دیا گیا۔

یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
کہ ناداں گر گئے سجدہ میں جب وقت قیام آیا

شاہ جی کی زندگی کے بے شمار دن اور راتیں تفہیم قرآن اور بیان اسوہ حسنہ میں صرف ہوئیں۔ ہندوستان کے ہر خطہ میں مانوس لب و لہجہ میں، ظرف مخاطب کے عین مطابق پیغام رسانی کے فریضہ کو بہ کمال احسن سر انجام دیا۔ یقین و عمل کا خوبصورت پیکر ایک لمحہ کے لئے بھی سکون پذیر نہیں ہوا۔ دین اسلام کے خلاف کھلنے والے ہر محاذ کے مقابل صف اول میں جماعت احرار کے ساتھ ستیزہ کار نظر آتے ہیں۔

ان کی بصیرت افروز گفتگو آج کے بین الاقوامی تناظر میں، از سر نو جائز کی متقاضی ہے۔ شمال میں کمیونزم کی پامالی، مغرب میں ارتکاز دولت کی وجہ سے زبوں حالی آئندہ آنے والی نصف صدی کے اندر اندر مغربی تہذیب چکا چوند کے ماند ہونے کا منظر پیش کر رہی ہے۔ ہمیں جلد یا بدیر ارتکاز دولت کے خلاف دینی بصیرت کے حصار میں رہتے ہوئے نہ صرف اپنی زندگیوں کو سنوارنا ہے۔ بلکہ انسانیت کی رہبری کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے۔ مکت نے بھی اب شخصیت سازی کا ہنر کھو دیا ہے۔ یونیورسٹی کی عنایات تو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ شاہ جی کی طرح جوہر کی تلاش، ان کی تراش اور نکھارنے کی ضرورت پہلے سے بھی دوچند ہے۔ ایسی شخصیات جو زندگی کے مختلف دھاروں پر ہماری شعوری طور پر رہنمائی کریں شعور کے سہارے زندہ رہنے کا راستہ دکھائیں۔ ترک و اختیار میں شعور کی کارفرمائیاں ہمارا شعار ہوں۔ دوستی اور دشمنی، محبت اور نفرت کی بنیاد صرف رضائے الٰہی ہو۔ انسانوں سے محبت، انسانوں میں موجود برائیوں سے نفرت ان کے لئے دکھ و کرب ہمارے محور ہوں۔ سخن دلنواز ہو، جاں پرسوز اور نگہ بلند رہے۔ کہ ہمارے میر کاروان

اسی رخت سفر کو لئے میدان کارزار میں اترے تھے۔ وطن عزیز سازشوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ ملت اسلامیہ ایک بار پھر اغیار کی چیرہ دستیوں کی شکار ہونے کو ہے۔ قیادت، نیابت، فضیلت اور تکریم کا معیار دولت کو قرار دیا جا چکا ہے۔ ارتکاز دولت کو جواز مہیا کر دیا گیا ہے۔ اب صاحب تکریم وہی ہے جو صاحب سرمایہ ہے۔ علم، کردار، تقویٰ، پرہیز گاری اور صلاحیت قابل ذکر سرمایہ نہیں۔ سرمایہ پرستی معاشروں کی موت ہے۔ اجتماعی مفادات کو مؤخر کرنے کا عمل تہذیبوں کے لئے کبھی بھی زندگی بخش نہیں ہو سکتا۔ انفرادی مفادات کو اجتماعی مفادات پر فوقیت یا ترجیح دینے کا عمل سراسر خود کشی ہے۔ رنگ، نسل، تہذیب، علاقائی اور گروہی بنیادوں پر ملت اسلامیہ کی تعمیر کا تصور سراسر کذب اور افتراء ہے۔ شاہ جی اور ان ایسے اکابر کی مانند اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے میدان عمل میں اترنا ہی شاہ جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ تکریم، قیادت اور نیابت کی ذمہ داریاں صاحبان علم و دانش، صاحبان کردار، تقویٰ، اور بصیرت کے حامل افراد کو سونپنے کا وقت آگیا ہے۔ منصب اہل افراد ہی کے لئے زیبا ہے۔ شاہ جی کو اکابر نے اہلیت کی بنیاد پر ہی امیر شریعت کے گرانقدر منصب جلیلہ کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اور تاریخی حقیقت ہے کہ انہوں نے منصب کے تقاضوں کو کمال احسن طریق سے نبھایا۔ وہ سخن فہم بھی تھے۔ سخن شناس بھی۔ جوہری بھی اور جوہر تراش بھی۔ افراد کا انتخاب، ان کی تراش خراش اور انکی اہلیت کے مطابق ذمہ داریوں کی سپردگی کا قرینہ انکی امارت کی صلاحیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ راست فکر، راست عمل، حق گو اور بے باک، بے لوث و بے غرض، جان ہتھیلی پر سجائے امیر شریعت کے تربیت یافتہ احباب پچھلی نصف صدی میں آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مرزا جی کی ٹیچی ٹیچی

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم وزیر آباد تشریف لائے۔ رات غلہ منڈی میں انہوں نے تقریر کی۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ تقریر سننے چلا گیا اور تو کچھ میری سمجھ میں نہ آیا البتہ ایک صاحب نے ایک پنجابی نظم پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

ٹیچی ٹیچی رب جانے کتھوں دی چڑیل اے
راتوں رات ہوندا جدھا مرزے نال میل اے

(خدا جانے ٹیچی ٹیچی کہاں کی چڑیل ہے جو رات کے وقت مرزا قادیانی سے ملاقات کرتی ہے)

میں اور میرے دوست اس پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور میں یہ شعر گاتا ہوا گھر کو آگیا۔۔۔ ٹیچی ٹیچی رب جانے کتھوں دی چڑیل اے۔۔۔ مرزائیت کے متعلق یہ میرا پہلا تاثر تھا۔

قاضی محمد حفیظ اللہ۔ پی سی ایس (ریٹائرڈ)